ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.2 (2026)
(April to June)

افضال احمد سید کی نظم: عالمگیری تناظر

Afzal Ahmed Syed's poem: A Global Perspective

ایمن ادریس

ایم فل اسکالر، شعبہ اُردو زبان و ادب، یونی ورسٹی آف سرگودھا

ڈاکٹر سمیرا اعجاز

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو زبان و ادب، یونی ورسٹی آف سرگودھا

Aiman Idrees
M.Phil Scholar, Department of Urdu Language and Literature, University of Sargodha
Dr. Sumaira Ijaz
Associate Professor, Department of Urdu Language and Literature, University of Sargodha

Article Details
Received:
June 10, 2026
Accepted:
June 20, 2026
Online Published:
June 30, 2026

Copyright: © 2026 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Globalization is a defining phenomenon of the contemporary era, shaping society, culture, civilization, identity, and literature. Modern Urdu nazm has critically engaged with these transformations, and Afzal Ahmed Syed stands as a prominent contemporary poet whose work reflects individual anguish, identity crises, cultural shifts, and the erosion of historical heritage. His poetry embodies globalization's impact, often articulated through symbolism and metaphor. This study analyzes selected poems of Syed using textual and analytical methods, situating them within intellectual, cultural, and civilizational contexts. The findings reveal that globalization in his poetry is not merely a socio-economic process but a complex human experience, moving from personal suffering to collective consciousness. His work thus offers a nuanced reflection of globalization's multifaceted dimensions.

Key words:Ahmed Syed, Modern Urdu Poetry, Global Perspective, Identity, Culture, Historical Consciousness, Symbol, Metaphor.

اُردو نظم کی شعری کائنات میں ۱۹۷۰ کے بعد ایک عصری آشوب اور بدلاؤ کی کیفیت نظر آتی ہے اسی منظر نامے کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر افضال احمد سید بھی ہیں۔ افضال احمد سید نے ۱۸ سال کی عمر میں اشفاق احمد کے ڈرامے اچے برج لاہور دے میں پچاس سالہ بوڑھے کا کردار کیا اور اپنی دھاک بٹھائی۔ افضال احمد سید نے پاکستان کی فلم انڈسٹری میں متعدد فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ جدید اُردو نظم میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے آزاد اور نثری نظم میں علامتی اور تجریدی اسلوب اختیار کیا۔ ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلا مجموعہ چھینی ہوئی تاریخ ہے افضال احمد سید کی نظم میں تیسری دنیا کا آشوب، بدلتے منظر نامے میں فرد کی حیثیت، جذبات کا ہیجان انگیز تاثر اور عالمگیریت کے اثرات موجود ہیں، جنگ کے واقعات، مختلف تہذیبوں کا سنگم

اور بین المتونیت کا بھی اثر موجود ہے۔ چھپنی ہوئی تاریخ کی سب سے پہلی نظم کا عنوان ہے شاعری میں نے ایجاد کی۔ انظم کا بنیادی جوہر یہی ہے کہ یہ نظم انسان کی تاریخ اور اس کی ایجادات کی کہانی کا بیان نہیں ہے بلکہ اس میں قبضے، طاقت، استحصال اور مزاحمت کی کہانی صاف نظر آتی ہے۔ افضال احمد سید کا شعور یہ نہیں کہتا کہ انسان نے فلاں چیز ایجاد کی بلکہ وہ دکھاتا ہے جو چیز کسی بھی ضرورت کے تحت پیدا ہوئی وہ فوراًہی طاقت ور کے قبضے میں چلی گئی، جیسا کہ ان کے ایک نظم ہے "شاعری میں نے ایجاد کی" اس نظم کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

کاغذ مراکشیوں نے ایجاد کیا
حروف فونیشیوں نے
شاعری میں نے ایجاد کی
قبر کھودنے والے نے تندور ایجاد کیا
تندور پہ قبضہ کرنے والوں نے روٹی کی پرچی بنائی
روٹی لینے والوں نے قطار ایجاد کی
اور مل کر گانا سیکھا۔(۱)

افضال احمد سید کی یہ نظم عالمگیریت کے تناظر میں انسانی تاریخ اور سماجی ارتقا کے تضادات کو نہایت باریک بینی سے آشکار کرتی ہے۔ نظم میں مختلف ایجادات جیسے کاغذ، حروف، تندور، روٹی اور قطار کو علامتی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب بظاہر انسانی ترقی کی علامتیں ہیں، لیکن افضال احمد دکھاتے ہیں کہ ہر ایجاد طاقتور طبقے کے ہاتھ میں استحصال کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ عالمگیریت بھی اسی طرح ہے: ایک طرف یہ دنیا کو قریب لاتی ہے، علم، ٹیکنالوجی اور ثقافت کو پھیلاتی ہے، مگر دوسری طرف کمزور طبقات کے لیے نئے مسائل اور محرومیاں پیدا کرتی ہے۔ "روٹی کی قطار" اور "فاقہ" کا ذکر عالمی معاشی نظام کی ناہمواری کی طرف اشارہ ہے، جہاں ترقی کے باوجود بھوک اور غربت بڑھتی ہے۔ اسی طرح "ریشم کا کیڑا" اور "محل سرا میں استحصال" اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وسائل اور محنت کش طبقے کی پیداوار اشرافیہ کے عیش و عشرت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ منظر نامہ عالمگیریت کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک اور کمزور طبقات عالمی نظام میں استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ افضال احمد نے "رفتار، جنگ، شکست" کو ایجاد کے نتائج کے طور پر بیان کیا ہے، جو عالمگیریت کے منفی پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ تیز رفتار ترقی اکثر جنگی مقابلے، معاشی شکست اور ثقافتی زوال کا سبب بنتی ہے۔ اس طرح نظم یہ بتاتی ہے کہ ایجاد اور ترقی کا عمل ہمیشہ انسانی خوشحالی کا ضامن نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ظلم اور محرومی کو جنم دیتا ہے۔ آخر میں افضال احمد یہ واضح کرتے ہیں کہ شاعری محض فن نہیں بلکہ انسانی شعور ہے۔ عالمگیریت کے تناظر میں یہ جملہ نہایت اہم ہے، کیونکہ شاعری ظلم اور استحصال کے خلاف احتجاجی شعور کو بیدار کرتی ہے۔ افضال احمد سید کی یہ نظم دراصل ایک ادبی احتجاج ہے جو عالمگیریت کے تضادات کو علامتی اور فکری انداز میں سامنے لاتی ہے۔ افضال احمد سید کی نثری نظم عصری تقاضوں کے مطابق تاریخی واقعات میں الجھی ہوئی انسانیت کی بازگشت ہے اس سلسلے میں فرح عابد اپنے مقالہ میں لکھتی ہیں:

"۷۰ کی دہائی سے تعلق رکھنے والے نظم نگاروں میں رزمیہ شاعری اور عظیم شعری تجربے کے حامل شعراء میں افضال احمد سید نمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بیانیہ اور مکالماتی انداز اختیار کیا اور نظم میں بین الاقوامی خاص طور پر تیسری

دنیا کے پسے ہوئے مفلوک الحال عوام کے مسائل پر قلم اٹھایا ان کی نظمیں
استحصالی معاشروں میں پلنے والے نادار اور مفلس عوام کے جذبات کی ترجمانی
کرتی ہیں ان کی بیش تر نظمیں ۱۹۷۰ء میں بیروت میں قیام کے دوران انکھوں
دیکھے مشاہدات کی ترجمان ہیں"۔(۲)

اسی مجموعہ کی دوسری" نظم تل زعتر سے نشیب" کے عنوان سے ہے۔ تل زعتر ۱۹۷۶ میں بیروت میں فلسطینیوں کا ایک پناہی گزین کیمپ تھا۔ جہاں اسرائیل بائیں بازو کے شدت پسندوں نے ۵۲ روز تک کیمپ کا محاصرہ کیا اور کیمپ پر بمباری کی اس وقت بچوں اور نوجوانوں عورتوں کو جس کرب اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا افضال احمد سید نے اپنی اس نظم میں انتہائی حقیقی تصویریں کھینچی ہیں اس سانحے میں مرنے والوں کو قبر بھی نامل سکی وہ بے گوروکفن لاشوں کے انبار عالمی امن کے اداروں کے سامنے سوالیہ نشان کے طور پر موجود ہیں۔ یہ نظم بنیادی طور پر ایک ایسے انسان کی آواز ہے جس کے حصے میں صرف بچا کھچا حصہ آیا نہ بچپن آیا، نہ وطن، نہ تحفظ۔ افضال احمد سید خود کو "بادل کا وہ ٹکڑا" کہتا ہے جسے پتھر سے باندھ کر ڈبو دیا گیا ہو، یعنی ایسا وجود جسے جینے کا حق دیے بغیر ہی ختم کرنے کا راستہ دکھا دیا گیا ہو یہاں ایک زندہ وجود نہیں رہتا بلکہ جنگ، جلاوطنی اور کیمپوں میں پلنے والی پوری انسانیت کی مشترکہ یادداشت بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں نہ خاندانی قبرستان ہے، نہ تہوار، نہ مہمان، نہ کھیل۔ کھلونے چوہے دان بن جاتے ہیں اور دوپہر وباؤں کی بستیوں میں آہ وبکا سنتے گزر جاتی ہے۔ یہ وہ بچپن ہے جو بھوک، خوف اور تشدد کے سائے میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا۔ افضال احمد سید کہتے ہیں:

میں بادلوں کا وہ ٹکڑا ہوں
جسے پتھر سے باندھ کر
ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے
میرا کوئی خاندانی قبرستان نہیں ہے
وطن سے دور مرنے کی رسم (۳)

مذکورہ بالا نظم میں جدید دنیا میں فرد کی محرومی کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ جدید دنیا میں محرومی کوئی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ کرائے کے فوجی، وطن سے دور موت، ڈائسپورا کا احساس فاتح اور مفتوح دونوں کا ایک ہی طرح بھیڑوں کی طرح کھا جانا—یہ سب اس عالمی نظام کی علامتیں ہیں جہاں جنگ کاروبار بن چکی ہے۔ وسائل چند ہاتھوں میں سمٹ جاتے ہیں ساری کپاس شہزادوں کے کفنوں کے لیے ہے، سارا ریشم شہزادیوں کی جرابوں پر، جبکہ عام آدمی کے حصے میں جلی روٹی اور آدھا شوربہ آتا ہے۔ اس طرح عالمگیریت ترقی یا خوشحالی نہیں بلکہ طبقاتی ناانصافی کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ اس نظم میں وقت کو بھی ثبات نہیں نا وہ سلامت رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پچھلے سال کے تمام دن ایک ہی قبر میں سلا دیے گئے اور غلطی سے نئے سال کا پہلا دن بھی دفن ہو گیا۔ یہ اس احساس کا کھلا اظہار ہے کہ مسلسل بحران اور ناانصافی نے نے مستقبل کا تصور ہی چھین لیا ہے۔ دن، تاریخ اور امید سب علیل ہو چکے ہیں۔ موت ایک دن یا ایک جگہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ پورے وقت میں پھیل جاتی ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جہاں زندگی محض گزارنے کا عمل بن جاتی ہے اور جینے کا چراغ بجھ جاتا ہے اس سب کے باوجود نظم مکمل مایوسی پر ختم نہیں ہوتی۔ آخر میں آواز بدلتی ہے اور شاعر اپنے اندر ایک مزاحم قوت پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ روشنی کو پھر اوپر اٹھائے گا، زخموں میں فتح کا اعلان

لکھے گا، اور حسن کو — محبوب کی آنکھوں کو — تلوار کے دستے پر سجا دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب حسن، محبت اور شاعری معصوم نہیں رہ سکتیں؛ انہیں ظلم کے مقابل کھڑا ہونا ہو گا۔ افضال احمد سید کی یہ نظم ہمیں بتاتی ہے کہ جب دنیا انسان سے سب کچھ چھین لے، تب بھی تخیل اور مزاحمت وہ آخری جگہ ہیں جہاں انسان خود کو بچا سکتا ہے۔ افضال احمد سید کی نظم "مٹی کی کان" اپنے بنیادی جوہر میں جدید انسان کی زندگی میں اجنبیت، استحصال، وجودی کرب اور آزادی کی جبلّت کا استعارہ ہے۔ نظم کا راوی ایک ایسا تھکا ہارا مزدور ہے جو محض جسمانی محنت نہیں کر رہا بلکہ اس کا جسم، صلاحیتیں، شناخت، یادداشت اور خواب سب کان کے نظام میں تحلیل ہو رہے ہیں۔ مزدوروں کے اعضا کا آپس میں بدل جانا اس بات کی علامت ہے کہ جابرانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور انسان محض ایک قابلِ استعمال پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔ "تلاشی"، "پابندیاں"، "آگ"، "پانی کی ممانعت" اور "نگران" دراصل طاقت، ریاست، سرمایہ اور نظم وضبط کے وہ مظاہر ہیں جو انسان کے جسم اور خواہش دونوں پر قبضہ کیے رکھتے ہیں۔ جیسا کہ نظم میں بیان کیا گیا ہے۔

میں مٹی کی کان کا مزدور ہوں
کام ختم ہو جانے کے بعد ہماری تلاشی لی جاتی ہے
ہمارے نگران ہمارے بند بند الگ کر دیتے ہیں
پھر ہمیں جوڑ دیا جاتا ہے
ہمارے نگران ہمیں لاپروائی سے جوڑتے ہیں (۴)

عالمگیریت (Globalization) کے تناظر میں اگر اس نظم کو دیکھیں تو مٹی کی کان کسی ایک ملک یا خطے تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ عالمی نظامِ پیداوار کی علامت بن جاتی ہے، جہاں ترقی یافتہ اقوام کے آرام کی قیمت تیسری دنیا کے مزدور اپنے جسم، وقت اور زندگی سے ادا کرتے ہیں۔ پانی، آگ اور روٹی جیسی بنیادی ضرورتوں پر پابندی دراصل اس عالمی معاشی نظام کی طرف اشارہ ہے جہاں وسائل پر طاقت ور اقلیت کا قبضہ ہے اور کمزور اکثریت کو محض زندہ رہنے کے لیے بھی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ مزدور بھی "چوری" کو اخلاقی برائی نہیں بلکہ بقا کی حکمتِ عملی سمجھ رہا ہے جو اس نظام کے اخلاقی دیوالیے پن کو بے نقاب کرتا ہے، مزید نظم کی چند سطروں میں دیکھئے:

مٹی کی کان میں آگ کا ایک اور کام بھی ہے
کبھی کبھی نگران ساری کان کو اچانک خالی کرانا چاہتے ہیں
اس وقت کام میں آگ پھیلا دی جاتی ہے
اس دن اگر کوئی سلامت نکل جائے تو اس کی تلاشی نہیں لی جاتی
مٹی ایسے ہی دن چرائی جا سکتی ہے
میں نے ایک ایسے ہی دن مٹی چرائی تھی۔" (۵)

جدید اُردو نظم میں افضال احمد سید کا نام نثری نظم کی ایک بلند آواز ہے مٹی کی کان میں جس طرح سے بنیادی عناصر جو زندگی کے آغاز اور اس کی تکمیل کا حصہ ہیں اور انسان کی حیثیت مٹی کے ساتھ اس کا خوبصورت تعلق پیش کیا ہے۔ اقبال شاہ اس حوالے سے اپنے مقالے میں رقمطراز ہیں:

"مٹی کی کان میں، میں ایک سرے سے داخل ہوا اور اس میں گھومتے گھومتے
دوسرے سرے پر جا نکلا تب جا کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ مٹی کی کان نہیں بلکہ یہ
تہذیب، ثقافت، رسومات اور روایات سے گریز پا اور رجوع بکار ہو کر جدید، جدید
تر اور جدید ترین ادبی معدنیات کی طلائی کان ہے یہاں ادبی کیمیا گری کے خزانے
چھپے ہوتے ہیں جس کے لئے کیمیا گر بننا پڑے گا"۔(۶)

فنی حوالے سے نظم علامتی، بیانیہ اور تجریدی اسلوب کا حسین امتزاج ہے۔ افضال احمد سید آزاد نظم میں ایک طویل بیانیہ تخلیق کرتے ہیں جس میں تمثیل، داخلی مکالمہ تکرار اور خواب و حقیقت کی آمیزش قاری کو ایک ڈراؤنے مگر مانوس جہان میں لے جاتی ہے۔ نظم میں "آدمی بنانے" کا تصور تخلیقی مزاحمت (Creative Resistance) کی علامت ہے، جہاں شاعر اس مٹی کی کان کی سڑن میں سے زبان، محبت، سفر اور فطرت کے ذریعے ایک نئے انسان اور ایک نئی دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔ زبان سادہ ہونے کے باوجود گہری تہ داری رکھتی ہے، اور یہی اس نظم کا فنی کمال ہے کہ وہ ذاتی تجربے کو اجتماعی اور عالمی المیے میں بدل دیتی ہے۔ یوں "مٹی کی کان" محض ایک نظم نہیں بلکہ جدید دنیا کے خلاف ایک طویل، خاموش اور باوقار احتجاج بن جاتی ہے۔ افضال احمد سید کی نظم "گون زاگو کہاں مارا گیا" کا مرکزی نکتہ دراصل متن کی شکست وریخت، معنی کی غیر یقینی صورتحال اور تاریخ و بیانیے کی از سرِ نو تشکیل ہے۔ یہ نظم بظاہر ایک قتل کا تفتیشی عمل ہے، مگر حقیقت میں یہ فن، سچ، قاری اور اقتدار کے باہمی رشتے پر ایک گہرا فکری سوال ہے۔ گون زاگو کا قتل کسی ایک مقام، ہتھیار یا فرد سے منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بغلی دروازے پر مارا گیا، اسٹیج کے وسط میں یا اسی کھیل کے مسودے میں یوں نظم یہ واضح کرتی ہے کہ جدید دنیا میں حقیقت کسی واحد مرکز سے وابستگی نہیں رکھتی بلکہ وہ بکھری ہوئی علامتوں، بیانیوں اور متون میں تحلیل ہو چکی ہے۔ یہی نظم کا بنیادی فکری تناؤ ہے۔ جیسا کہ افضال احمد سید کہتے ہیں:

گون زاگو کہاں مارا گیا
بغلی دروازے کے پیچھے
اسٹیج کے وسط میں
یا کھیل کے مسودے کے اندر (۷)

بین المتونیت (Intertextuality) اس نظم کی ساخت کی بنیاد ہے اور اس نظم کی مجموعی بنت میں کار فرما ہے۔ گون زاگو براہِ راست شیکسپیئر کے ڈرامے ہیملٹ سے ماخوذ ہے، جہاں ہیملٹ ایک فرضی ڈرامہ (The Murder of Gonzago) اسٹیج کرواتا ہے تاکہ اپنے باپ کے قتل کی حقیقت جانچ سکے کیونکہ اس کے باپ کو اس کے چچا نے سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے مار دیا تھا اور اس کی ماں سے شادی کر لی۔ افضال احمد سید اس ثانوی، فرضی کردار کو مرکز میں لا کر اصل متن (ہیملٹ) کو الٹ دیتے ہیں۔ یوں حاشیہ ہی متن بن جاتا ہے اور متن خود حاشیہ۔ نظم میں شیکسپیئر اور سال بیلو کا حوالہ اس بات کو مزید واضح کرتا ہے کہ یہ نظم ایک ہی متن کی نہیں ہے بلکہ ادبی روایتوں کے مکالمے کی پیداوار ہے۔ قاری کو "سچ" جاننے کے لیے نئی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی ایک متن پر نہیں بلکہ کئی متون کے درمیان سفر کرنا پڑتا ہے۔

گون زاگو کو جس چیز سے قتل کیا گیا
کبھی شناخت نہ ہونے والے زہر

کبھی نظر نہ آنے والی چوٹ
یا اس مکالمے سے جو اسے کبھی ادا نہیں کرنا تھا(۸)

یہ نظم بین العلومیت ((Interdisciplinarity کی بھی نمائندہ ہے۔ اس میں انگریزی ادب کی روایت کے ساتھ ساتھ ڈرامہ، تاریخ، فلسفہ، تھیٹر، آثارِ قدیمہ، اور تفتیشی بیانیہ ایک ساتھ موجود ہیں۔ قتل کا سوال قانونی یا اخلاقی نہیں رہتا بلکہ جمالیاتی اور فکری ہو جاتا ہے: کیا زہر نے مارا؟ مکالمے نے؟ یا اس خاموشی نے جو ادا نہ ہو سکی؟ اس طرح نظم اداکاری، زبان، متن اور اسٹیج کو بطور "قاتل" پیش کرتی ہے۔ نظم کی فکری منازل مزید طے ہوتی ہیں تو افضال احمد سید اس نظم میں مزید تجسس کی فضا شامل کرتے ہیں دیکھیے۔

کھیل کا مسودہ کس نے لکھا ہے
کھیل کا مسودہ انھوں نے نہیں لکھا
جنہوں نے گون زاگو کو قتل کیا
کھیل کا مسودہ اس نے لکھا
جو گون زاگو کی قبر میں دفن ہوا
گورکنوں کی ایک نسل سے گزر کر
میں نے گون زاگو کی بے شناخت قبر کا پتہ چلا لیا
مگر مجھے اس کی قبر میں کھیل کا کوئی مسودہ نہیں ملا(۹)

افضال احمد سید کی نظم "چھینی ہوئی تاریخ" فکری اور فنی دونوں سطحوں پر جدید اُردو نظم میں معنویت سے بھرپور اور علامتیت کی گہری مثال ہے۔ نظم میں چھینی ہوئی تاریخ سب سے مرکزی علامت ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ محکوم انسان سے اس کی شناخت، یادداشت، ماضی، اور روایت سب چھین لیا جاتا ہے۔ تعلیم، شاعری محبت، محنت،، تہوار، اور روزمرہ زندگی کی وہ تصویریں اور زندگی کی علامتیں ہیں جسے طاقت کے نظام نے روند دیا ہے۔ فکری اعتبار سے یہ نظم جبر، تشدد، عالمی سیاست، ریاستی طاقت، سرمایہ دارانہ نظام اور انسان کی بے قدری کے خلاف ایک وجودی احتجاج ہے۔ نظم کا آغاز دیکھیے۔

ہم براہ راست حملے میں بچ گئے
اور اب چن چن کر مار دیے جانے کی
کارروائی کے دوران جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں
ابھی ہم اتنے اہم نہیں ہوے
کہ کسی حساس اسلحہ پر ہمارے دل کی نشاندہی کر کے
ایک منجمد موت ہمارے پیچھے لگا دی جائے(۱۰)

جہاں نظم میں براہ راست حملے میں بچ جانے والوں کی تکلیف دہ حالت زار کو دکھایا گیا ہے کہ دنیا میں جبر اور ظلم کا حل صرف ایک مشاورتی اجلاس اور ماہرین کے پینل شہر کے پر رونق ہوٹل میں بیٹھے سیمینار کرتے ہیں شاعر کسی ایک واقعے یا خطے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اجتماعی انسان کی اس حالت کو بیان کرتا ہے جو جدید دنیا میں مسلسل نگرانی، عالمی دباؤ، عسکری قوت اور تجزیاتی نظاموں کے

ہاتھوں اپنی شناخت، وجود حتیٰ کہ تاریخ تک سے محروم کر دیا گیا ہے۔ نظم کا بنیادی مسئلہ زندہ ہوتے ہوئے مٹ جانا ہے؛ یعنی انسان کا جسمانی طور پر موجود ہونا مگر تاریخی، سماجی اور اخلاقی سطح پر غیر موجود قرار دیا جانا۔ مزید نظم سے اقتباس ملاحظہ ہو:

ہم کیوں بچ جاتے ہیں
ماہرین کا پینل
ایک پر رونق شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل میں
ایک سیمینار کر رہا
شاید یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے
کہ ہم میں دوہری مزاحمت پیدا ہو گئی ہے
بلد کے کسی بھی طول و عرض پر
ہم جیسے کسی بھی آدمی کو مار دیا جاتا ہے۔(۱۱)

فنی اعتبار سے نظم نثری نظم کی تکنیک میں بیانیہ، علامت اور تجرید ایک حسین امتزاج ہے۔ نظم کا لہجہ تلخ، کٹا ہوا اور حقیقی رپورٹ نما ہے، جو جدید عہد کے سائنسی، عسکری اور تجزیاتی ڈسکورس کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ یہی اس نظم کا فنی کمال ہے کہ افضال احمد سید نے جذباتی واویلا کے بجائے طاقت کے نظام کی بے رحمی کو اسی کی زبان میں بے نقاب کیا ہے۔ (''شاید''، ''ہم'') کی تکرار ایک طرف عدمِ یقین اور وجودی بحران کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری طرف اجتماعی شعور کو اجاگر کرتی ہے۔ علامتی سطح پر نظم کئی جہتیں رکھتی ہے اور یہ علامتیں نظم کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں براہ راست حملہ، منجمد موت، حساس اسلحہ، بندوق کی نال، تجزیاتی تجربہ گاہ جدید جنگ، ڈرون ٹیکنالوجی اور ریاستی تشدد کی علامتیں ہیں جہاں انسان محض ''ڈیٹا'' یا ''ہدف'' بن جاتا ہے۔ سفارت خانہ، جھنڈا، بیمہ، مراعات عالمی سیاسی و معاشی نظام کی اس منافقت کی علامت ہیں جہاں تحفظ صرف طاقتور کو حاصل ہے۔ کبھی نہ ڈوبنے والا جہاز اشرافیہ اور عالمی طاقتوں کے محفوظ دائرے کی علامت ہے جو دوسروں کی بربادی کو دور سے دیکھتے ہیں۔ قسط وار تحلیل اور تجزیاتی رپورٹ انسان کو سائنسی اور انتظامی زبان میں ختم کیے جانے کا استعارہ ہیں، جہاں قتل بھی ایک تکنیکی عمل بن جاتا ہے۔ پھر شناخت کا بحران اٹھتا ہے کہ شاید ہم اس ملک میں پیدا ہی نہیں ہوئے اور شاید جن مکانوں میں وہ رہ رہے ہیں ان کا کرایہ ہمارے والدین نے دینے کے لیے ایک وقت کا کھانا نظر انداز کر دیا۔

آخر میں ریت کی چار بوریاں وقتی، ناکافی اور بے بس تحفظ کی علامت بن کر سامنے آتی ہیں، جو زندگی کو بچانے کے لیے کافی نہیں ہیں افضال احمد سید اس نظم میں جدید انسان کے اس المیے کو پیش کرتے ہیں جہاں زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ طاقت کے ادارے طے کرتے ہیں، اور تاریخ ایک ایسی شے بن جاتی ہے جو کمزوروں سے چھین لی جاتی ہے۔ جدید اُردو نظم کے حوالے سے یہ نظم اس رجحان کی نمائندہ ہے جہاں ذاتی تجربہ اجتماعی کرب میں ڈھل جاتا ہے، بیانیہ شاعری کے روایتی حسن سے ہٹ کر فکری شدت اختیار کر لیتا ہے، اور علامتیں کسی ایک معنی تک محدود نہیں رہتیں بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی۔ افضال احمد سید نے جداگانہ اسلوب اپناتے ہوئے اپنے عہد کی تاریخ کو انسانیت کے دکھ اور اس کے ذاتی شناخت کے المیے کو جوڑ کر نظمیں لکھیں ہیں جہاں ایک انسان کا درد پوری انسانیت کا نوحہ بن کر گونجتا رہتا ہے اس طرح کی ایک اور نظم جہاں زندہ رہنے کے لئے ایک آخری تاریخ کو شناخت کے مسئلے کے ساتھ لکھا ہے ان کی نظم "زندگی رہنے کی آخری تاریخ" اس کی بہترین مثال ہے۔

ھماری سانسوں کی کوئی
شناختی دھن نہیں
اور ہمارے خون کو
آبی صابن سے بہ آسانی دھویا جاسکتا ہے
پیشگی اجازت کے بغیر
ھم اپنی برساتی
یا اپنے جوتوں کا رنگ تبدیل کرسکتے ہیں
خواب میں (۱۲)

افضال احمد سید کی نظم "زندہ رہنے کی آخری تاریخ" جدید دور کے انسان کے وجودی کرب اور شناخت کے بحران کا بلیغ علامتی اظہار ہے۔ اس نظم میں شاعر نے عام الفاظ کو گہری علامتوں میں ڈھال کر ایک ایسے عہد کی تصویر کھینچی ہے جہاں انسان کی قدر، اس کی شناخت اور اس کی بقا سب غیر یقینی ہو چکے ہیں۔ سب سے اہم علامت "تاریخ" کی ہے۔ ایک تاریخ تو اندراج ہے گزرے لمحوں کا جو ایک مکمل عہد کی دستاویز ہوتی ہے مگر یہاں تاریخ اپنے اس مفہوم میں برتی گئی ہے جہاں وہ کسی کام کی آخری مدت یا میعاد کو ظاہر کرتی ہے، جیسے کسی دوا یا دستاویز کی "ایکسپائری ڈیٹ"۔ شاعر نے زندہ رہنے کے ساتھ "آخری تاریخ" کا لفظ جوڑ کر یہ بتانا چاہا ہے کہ عالمگیریت کے دور میں انسان کی قدر اس کی افادیت اور کارکردگی سے جڑی ہے؛ جدید دنیا میں انسان کی زندگی بھی ایک پروڈکٹ کی طرح ہوگئی ہے جس کی مدت مقرر ہے۔ جب تک وہ نظام کے لیے مفید ہے، وہ اس کے چلتے ہوئے روز کے چکر کا حصہ ہے وہ زندہ ہے، ورنہ اس کی "میعاد" ختم سمجھی جاتی ہے۔ یہ علامت جدید سرمایہ دارانہ نظام پر گہرا طنز بھی ہے۔ "شناختی دھن" کا استعارہ بھی نہایت معنی خیز ہے۔ شناخت کا ساتھ دھن کا لفظ اسکی اہمیت کو اس طرح واضح کر رہا ہے جیسے ہر ساز کی اپنی دھن یا ردھم انفرادیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب شاعر کہتا ہے کہ ہماری سانسوں کی کوئی شناختی دھن نہیں، تو وہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرد اپنی انفرادی پہچان کھو چکا ہے۔ عالمگیریت نے ثقافتی اور تہذیبی فرق مٹا کر انسانوں کو ایک جیسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ نتیجتاً ہر شخص بھیڑ کا حصہ بن گیا ہے، اس کی اپنی الگ آواز یا ردھم باقی نہیں رہی۔ "آبی صابن" سے خون کو دھو دینے کی بات ایک اور گہری علامت ہے۔ خون عام طور پر زندگی، قربانی، رشتے اور سچائی کی علامت ہے۔ لیکن اگر خون کو آسانی سے صابن سے دھویا جاسکتا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ تمام ناسور جو کہ جرم، ظلم اور تشدد کی صورت میں موجود ہیں انھیں بھی آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے۔ جدید میڈیا اور عالمی سیاست کے تناظر میں سچ کو دھو دینا، حقائق کو صاف کر کے پیش کرنا اور انسانی المیے کو معمولی خبر بنا دینا عام ہو چکا ہے۔ گویا انسانی خون کی حرمت باقی نہیں رہی۔ مجموعی طور پر یہ نظم جدید انسان کے دکھ اور بے معنویت کو بیان کرتی ہے۔ اس کی زندگی کی "آخری تاریخ" مقرر کر دی گئی ہے۔ وہ آزادی بھی محض خواب یا داخلی دنیا تک محدود ہے، جبکہ خارجی دنیا میں وہ ایک ایسی شے بن چکا ہے جس کی میعاد ختم ہو سکتی ہے۔

سادہ لفظوں میں، یہ نظم اس احساس کو بیان کرتی ہے کہ آج کا انسان زندہ تو ہے، مگر اس کی زندگی اس کی اپنی نہیں رہی۔ اس کی شناخت مدھم ہے، اس کا خون بے قیمت ہے، اور اس کے وجود پر ایک غیر مرئی "آخری تاریخ" ثبت ہو چکی ہے۔ یہی جدید عہد کا سب سے بڑا کرب ہے۔ افضال احمد سید کی نظم "جس کا کوئی انتظار نہ کر رہا ہو" دراصل اُس انسان کی علامتی داستان ہے جو جدید اور مابعد جدید عہد کی دیواروں میں پس کر اپنی سماجی معنویت کھو رہا ہے۔ نظم میں بار بار دہرایا جانے والا جملہ "جس کا کوئی انتظار نہ کر رہا ہو" ایک

ایسے فرد کی علامت ہے جو دنیا کی زندگی، اجتماعی رشتوں، محبتوں اور شناختی نظام سے کٹ چکا ہے۔ مابعد جدیدیت کے تناظر میں فرد کا کوئی بڑا بیانیہ (Grand Narrative) نہیں رہتا بلکہ ٹوٹے ہوئے، منتشر اور غیر یقینی خیالات میں پتھرائے ہوئے وجود نظر آتے ہیں۔ نظم کا ابتدائیہ دیکھئے:

جس کا کوئی انتظار نہ کر رہا ھو
اسے نہیں پھرنا چاھیے
بے قرار
ایک خوبصورت راہداری میں
جب تک وہ ویران نہ ھو جائے
جس کا کوئی انتظار نا کر رہا ہو
اسے نہیں جدا کرنا چاھیے
خون آلود پاؤں سے ایک پورا سفر
جس کا کوئی انتظار نہ کر رھا ھو
اسے نہیں معلوم کرنی چاہیے
پھولوں کے ایک دستے کی قیمت
یا دن تاریخ اور وقت (۱۳)

آخری دروازہ" اختتام، ممکنات کے خاتمے یا معاشرتی رسائی کے بند ہو جانے کی علامت ہے، جب کہ "خوبصورت راہداری" اُس دلکش مگر کھوکھلی تہذیبی فضا کی نمائندگی کرتی ہے جو عالمگیریت نے پیدا کی ہے۔ جہاں بظاہر کشش ہے مگر اندر سے ویرانی۔ "خون آلود پاؤں سے ایک پورا سفر" جدوجہد، کرب اور تاریخ کے زخمی تسلسل کی علامت ہے؛ ایسا سفر جو معنی کی تلاش میں طے کیا گیا مگر جس کی کوئی منزل یا سماجی تصدیق نہیں۔ اسی طرح "پھولوں کے دستے کی قیمت، دن، تاریخ اور وقت معلوم نہ کرنا" سرمایہ دارانہ اور منڈی پر مبنی عالمی نظام سے لاتعلقی کو ظاہر کرتا ہے، جہاں ہر شے کی قیمت ہے مگر انسان کی نہیں س اور یہی مابعد جدید عہد کا المیہ ہے کہ انسان ہجوم میں رہتے ہوئے بھی کسی کے انتظار کا مرکز نہیں رہتا۔ عالمگیریت کے زیرِ اثر فرد محض ایک غیر اہم اکائی بن جاتا ہے جس کی موجودگی یا غیر موجودگی برابر ہو جاتی ہے۔ نظم ایک ایسے وجودی کرب کو پیش کرتی ہے جو شناخت کے بحران، تنہائی اور سماجی بے معنویت سے جڑا ہوا ہے۔ افضال احمد سید نے تاریخ کو زندہ رکھتے ہوئے اسے موجودہ دنیا کے مسائل سے جوڑ دیا ہے، اور نظم کو محض ادبی تخلیق نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور سیاسی احتجاج کی صورت میں پیش کیا ہے۔

نظم "دو زبانوں میں سزائے موت" افضال احمد سید کی یہ نظم ایک مکمل داستان ہے جس میں عالمگیریت کے اثرات نمایاں ہیں جیسا کے ان نظموں کے عنوانات میں درج کی گئی علامتیں خود اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ نظم ہولوکاسٹ اور جبری مشقت کے کیمپوں کے پس منظر میں انسانی وقار اور مزاحمت کی علامتی تصویر پیش کرتی ہے، جہاں ریاستی طاقت انسان کی شناخت کو ایک نمبر یا شے میں بدل دیتی ہے۔

ہمیشہ پر سکون رہنے والی

مالا زیبتام
کیمپ گارڈ کے درمیان سے نکل گئی
اُس کے ساتھ ایڈورڈ بھی جو اس پر عاشق تھا
مجھے ہاتھ مت لگاؤ" پھر سے گرفتار ہونے پر اس نے کہا
ہاتھ گاڑی میں ڈال کر اُس کا جسم دور تک لے جایا گیا
بچ نکلنے کے باوجود ایڈورڈ اس دن واپس آ گیا
اُسے دو زبانوں میں سزائے موت دی گئی
کیوں؟(۱۴)

نظم کا ماحول جبر اور ریاستی مشینری کی بے حسی سے بھرا ہوا ہے، جہاں محبت، فرار اور سزا سب ایک ہی نظام کے اندر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کردار اس جبر کے خلاف مختلف جہات میں انسانی مزاحمت کو ظاہر کرتے ہیں نظم کا جوہر محبت بمقابلہ ریاستی جبر، شناخت بمقابلہ نظام، اور جسم کی تذلیل بمقابلہ روح کی آزادی ہے: مالا زیبتام فعال بغاوت میں اپنی دو زبانوں اور پر سکون مزاج کے ذریعے موجود ہے جو لسانی دوہرا پن اور شناخت کے دوہرے وجود کو ظاہر کرتی ہے، اور "مجھے ہاتھ مت لگاؤ" کہہ کر وہ جسمانی خود مختاری اور اپنے ذاتی وقار کا اعلان کرتی ہے۔ ایڈورڈ محبت کرنے والا کردار ہے، جس کا فرار کے باوجود واپس آنا یہ دکھاتا ہے کہ محبت اور اخلاقی فیصلے ریاستی جبر سے بڑے ہیں؛ اس کی "دو زبانوں میں سزائے موت" اس بات کی علامت ہے کہ اس کا جرم ذاتی نہیں بلکہ علامتی ہے اور اسے یہ سزا محبت، مزاحمت اور شناخت کی سرحدوں کو توڑنے کے جرم میں دی جا رہی ہے کیمپ گارڈ ریاستی طاقت کی غیر شخصی قوت ہے، جو انسان کو گاڑی میں ڈال کر دور لے جانے کے عمل سے اسے محض ایک شے میں بدل دیتی ہے۔ یہ نظم محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ عصرِ حاضر کے عالمی نظام کی علامتی تصویر بھی ہے، جہاں "دو زبانیں" کثیر لسانی وجود اور شناخت کے تقسیم ہونے کی علامت ہیں اور مرکزی سوال "کیوں؟" اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ ایڈورڈ کو دو زبانوں میں ہی سزا کیوں سنائی گئی؟ اس لیے کہ اس کا جرم صرف فرار نہیں بلکہ محبت اور جبر کی نفی ہے، اور دو زبانوں میں سزا سنانا ثقافتی یا لسانی پناہ گاہ کو ختم کرنے مکمل خاموشی مسلط کرنے کی کوشش ہے اور کیمپ جدید دنیا کے حراستی مراکز اور مہاجرین کے کیمپوں کی یاد دلاتا ہے، گاڑی میں جسم لے جانا جدید ٹیکنالوجی اور بیوروکریسی کے ذریعے انسان کی نقل و حرکت پر کنٹرول کی علامت ہے، اور سزائے موت کا اعلان میڈیا اور سرکاری بیانیے کی طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ مجموعی طور پر نظم میں عالمگیریت کے اثرات اور انسانی جذبوں کے ساتھ وجودی کرب، سیاسی جبر، محبت بطور مزاحمت، اور عالمی نظام کی بے رحمی شامل ہیں۔ کردار انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی انسانی تجربے کی نمائندگی کرتے ہیں نتیجتاً یہ نظم ایک مخصوص تاریخی پس منظر رکھتے ہوئے بھی عصرِ حاضر کی علامت ہے، جہاں "دو زبانوں میں سزا" اس بات کی علامت ہے کہ عالمگیریت میں طاقت ہر سطح پر انسان کا تعاقب کرتی ہے، مگر نظم کا باطنی پیغام یہ ہے کہ محبت اور انسانی وقار، جبر کے مقابلے میں آخری اور ناقابلِ شکست سچ ہیں۔

افضال احمد سید کی نظم میں عالمگیریت محض ایک ضمنی خصوصیت نہیں بلکہ ان کے شعری وژن کا بنیادی محور ہے۔ ان کی شاعری مقامی و علاقائی حدود کو پھلانگتے ہوئے دنیا کے مختلف خطوں، تہذیبوں اور تاریخی سانحات کو اپنے اندر سمو لیتی ہے، اور یوں ذاتی و اجتماعی کرب کو ایک عالمگیر انسانی تجربے کی سطح پر لے آتی ہے۔ لاطینی امریکی جادوئی حقیقت نگاری اور مغربی جدیدیت سے اخذ کردہ

اسلوبیاتی و تخلیقی عناصر ان کے ہاں محض تقلید نہیں بلکہ ایک نئی اُردو شعری زبان کی تشکیل کا ذریعہ بنتے ہیں، جس میں علامت، اسرار اور کثیر الجہتی معنویت نمایاں ہیں۔ اس طرح افضال احمد سید کی نظم موضوعاتی اور اسلوبیاتی، دونوں سطحوں پر عالمگیریت کی نمائندگی کرتی ہے، اور جدید اُردو نظم کو ایک کاسموپولیٹن جہت عطا کرتے ہوئے اسے عالمی ادبی روایت کے ساتھ ہم کلام کر دیتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری اُردو ادب میں عالمگیریت کے شعری اظہار کی ایک منفرد اور اہم مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افضال احمد سید، شاعری میں نے ایجاد کی، (مشمولہ)، مٹی کی کان، کراچی، آج کی کتابیں، ۲۰۰۹ء، ص:۱۷

۲۔ فرح عابد اور طارق ہاشمی، افضال احمد سید کی نظم میں شعریتِ رزم، الحمد اُردو ریسرچ جرنل، اُردو شمارہ ۶

۳۔ افضال احمد سید، تل زعتر سے نشیب، (مشمولہ)، چھپنی ہوئی تاریخ، کراچی، آفسیٹ پریس، ۱۹۸۴ء، ص:۱۹

۴۔ افضال احمد سید، مٹی کی کان، (مشمولہ)، مٹی کی کان، ص:۲۶

۵۔ ایضاً، ص:۲۷

۶۔ .اقبال شاہ ایڈووکیٹ، افضال احمد سید، نثری نظم کے گرداب میں. "ہم سب, ۲۱ اگست ۲۰۲۳

۷۔ افضال احمد سید، گون زاگو کہاں مارا گیا، (مشمولہ)، مٹی کی کان، ص:۴۵

۸۔ ایضاً، ص:۴۴

۹۔ ایضاً، ص:۲۷

۱۰۔ افضال احمد سید، چھپنی ہوئی تاریخ، (مشمولہ)، چھپنی ہوئی تاریخ، ص:۵۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۵۱

۱۲۔ افضال احمد سید، زندہ رہنے کی آخری تاریخ، مشمولہ، دو زبانوں میں سزائے موت ، کراچی، ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء، ص:۲۲

۱۳۔ افضال احمد سید، جس کا کوئی انتظار نہ کر رہا ہو، (مشمولہ)، دو زبانوں میں سزائے موت، ص:۴۰

۱۴۔ افضال احمد سید، دو زبانوں میں سزائے موت، (مشمولہ)، دو زبانوں میں سزائے موت، ص:۸۵–۸۶

References in Roman Script

1. Afzal Ahmad Syed, "Shāʿirī Main Ne Ījād Kī," in Mitti Kī Kān, Karachi: Aaj Ki Kitaben, 2009, p. 17.
2. Farah Abid and Tariq Hashmi, "Afzal Ahmad Syed Kī Nazm Main Shiʿriyyat-e-Razm," Al-Hamd Urdu Research Journal, Urdu Issue 6.
3. Afzal Ahmad Syed, "Tal al-Zaʿtar Se Nasheb," in Chhīnī Huʾī Tārīkh, Karachi: Offset Press, 1984, p. 19.
4. Afzal Ahmad Syed, "Mitti Kī Kān," in Mitti Kī Kān, p. 26.
5. Ibid., p. 27.
6. Iqbal Shah Advocate, "Afzal Ahmad Syed: Nasrī Nazm Ke Gardāb Main," Hum Sub, 21 August 2023.

7. Afzal Ahmad Syed, “Gonzāgo Kahān Mārā Gayā,” in Mitti Kī Kān, p. 45.
8. Ibid., p. 44.
9. Ibid., p. 27.
10. Afzal Ahmad Syed, “Chhīnī Huʾī Tārīkh,” in Chhīnī Huʾī Tārīkh, p. 50.
11. Ibid., p. 51.
12. Afzal Ahmad Syed, “Zindah Rahne Kī Ākhrī Tārīkh,” in Do Zabānon Main Sazā-e-Maut, Karachi: Ibn-e-Hasan Printing Press, 1990, p. 22.
13. Afzal Ahmad Syed, “Jis Kā Koʾī Intizār Nah Kar Rahā Ho,” in Do Zabānon Main Sazā-e-Maut, p. 40.
14. Afzal Ahmad Syed, “Do Zabānon Main Sazā-e-Maut,” in Do Zabānon Main Sazā-e-Maut, pp. 85–86.